QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

ڈاکٹر سید علی اطہر شوکت کا شعری منظر نامہ : ملتان کی جدید شاعری میں جذبے، فکر اور اسلوب کا امتزاج

THE POETIC LANDSCAPE OF DR. SYED ALI ATHAR SHAUKAT: A SYNTHESIS OF EMOTION, THOUGHT AND STYLE IN MODERN MULTAN POETRY

1. **Fazil Khan**
   Scholar M.Phil. Urdu,University of Southern Punjab Multan
2. **Muhammad Saleem**
   Scholar M.Phil. Urdu,University of Southern Punjab Multan
3. **Dr. Munawar Amin**
   Assistant Professor,University of Southern Punjab Multan (Corresponding Author)
   Email: drmunawaramin143@gmail.com

Abstract:

The literary soil of Multan has consistently produced writers who transform regional sensibility into universal poetic expression. Dr. Syed Ali Athar Shaukat represents a vital continuation of this tradition. He is physician by profession and a poet by temperament. This article presents an analytical study of his poetic universe, examining the thematic and stylistic patterns found across his four published Poerty collections: ''Panchwan Mausam'', ''Jalti Rait Pr Mere Paon'', ''Lams'', and ''Uchatti Neend Ka Noha''. In his poetry, love, separation and union, loneliness, and the philosophy of time hold central importance. But these feelings are not limited to romantic expression. They also connect with social awareness, collective deprivation, and the decline of human values. In his poems, seasons are used as psychological metaphors, while in his ghazals, traditional refrains such as "city," "fog," and "lamp" are given new layers of meaning. Ali Athar's poetry exemplifies a meaningful synthesis of inherited form and contemporary sensibility, securing for him a distinct and credible position within Multan's modern Urdu literary landscape.

Keywords:
Modern Urdu poetry, Poem, Ghazal, Symbolism, Emotion and thought

کلیدی الفاظ: جدید اردو شاعری، نظم، غزل، علامت نگاری، جذبہ و فکر

اردو شاعری کی تاریخ میں ملتان کا نام ہمیشہ ایک ایسے علمی و ادبی مرکز کے طور پر لیا جاتا رہا ہے جس نے روایت اور جدت کے امتزاج سے کئی توانا آوازیں پیدا کی ہیں۔ یہ شہر جو اپنی صوفیانہ روایت، اولیاء کے مزارات اور صدیوں پرانی تہذیبی پرتوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بھی اپنی شعری زرخیزی سے کسی طور دستبردار نہیں ہوا۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں اور اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ملتان سے تعلق رکھنے والے شعرا نے اردو نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ اور انہی میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر سید علی اطہر شوکت کا ہے۔

علی اطہر شوکت کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ پیشے کے اعتبار سے طب سے وابستہ رہے مگر ان کی حسیت نے انہیں ہمیشہ شعر کی طرف مائل رکھا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ جس طرح اردو ادب میں متعدد معالج حضرات نے ادب کی آبیاری کی ہے. علی اطہر بھی اسی فہرست میں ایک معتبر اضافہ ہیں۔ ان کے ہاں طب اور شاعری دو متوازی دنیائیں نہیں بلکہ ایک ہی حساس ذہن کے دو اظہار ہیں۔ ایک جسم کے زخموں کا درماں کرتا ہے، دوسرا روح کے خلجان کو لفظوں میں ڈھالتا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر علی اطہر شوکت کی شعری کائنات کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے کلام میں موجود موضوعاتی تنوع، جذباتی گہرائی اور فنی محاسن کو سامنے لایا جائے اور ساتھ ہی یہ جانچا جائے کہ وہ روایت اور جدت کے درمیان کس توازن کے ساتھ اپنی شعری شناخت تعمیر کرتے ہیں۔

سید علی اطہر شوکت ۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کو ملتان کے علاقے محلہ چاہ بوہر والا میں ایک علمی و سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید سردار علی شوکت ایک باعزت اور علم دوست شخصیت تھے۔ جن کا خاندان تقسیم ہند کے موقع پر ہندوستان سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوا۔ یہ خاندانی پس منظر محض ایک سوانحی

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

تفصیل نہیں بلکہ علی اطہر کی شخصیت میں موجود اس متانت اور حساسیت کی جڑیں بھی اسی روایت میں تلاش کی جاسکتی ہیں جو سادات خاندانوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ گھر کا ماحول علم، تربیت اور نظم وضبط کا حامل تھا۔ اور یہی ماحول بعد میں ان کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوا۔

ابتدائی تعلیم انہوں نے ملتان کے ہی مشہور تعلیمی اداروں سے حاصل کی۔ جہاں ان کے والد بذاتِ خود ایک محتاط اور مہربان نگران کے طور پر موجود رہے۔ تعلیمی مراحل میں علی اطہر نے ہمیشہ نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اسی دوران ان کے اندر مطالعے اور تحریر کا ذوق پروان چڑھنے لگا۔ نوعمری ہی میں شعر و ادب کی طرف رغبت پیدا ہوگئی تھی۔ تاہم ان کا باقاعدہ تخلیقی سفر کالج کے زمانے میں نکھرنا شروع ہوا۔ جب انہوں نے ادبی جریدوں میں لکھنا شروع کیا۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان میں داخلے کے بعد (جہاں سے انہوں نے ۱۹۸۱ء میں ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی اور بعد ازاں مزید تخصص کی منازل طے کیں) ان کی شعری زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ میڈیکل کالج کے ادبی جریدے "صحیفہ ادب" سے ان کی وابستگی اس دور کی ایک اہم نشانی ہے۔ جس میں ان کی ابتدائی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی رہیں۔

طبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علی اطہر نے ۱۹۸۷ء میں محکمہ صحت میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدائی تقرری ضلع خانیوال کے ایک دور افتادہ علاقے چک حیدرآباد میں ہوئی، جہاں برسوں طبی خدمات انجام دینے کے بعد سن ۲۰۰۰ء میں انہیں ملتان شہر منتقل کر دیا گیا۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ایک ایسے دور میں جب طبی نظام کی مشکلات اور وسائل کی کمی عام تھی، علی اطہر نے نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھائیں بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی مدھم نہیں ہونے دیا۔ غالباً یہی وہ کشمکش تھی جس نے ان کی شاعری میں انسانی دکھ، محرومی اور سماجی بے اعتدالی کے موضوعات کو ایک خاص گہرائی بخشی۔

علی اطہر کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو ان کا بین الاقوامی تجربہ ہے۔ اپنی طبی اور سماجی خدمات کے سلسلے میں وہ مختلف بین الاقوامی تنظیموں سے وابستہ رہے اور اس ضمن میں فلپائن، کینیا، امریکہ اور ملاوی جیسے ممالک کا سفر کیا۔ ان اسفار نے ان کے تخلیقی تجربے کو وسعت بخشی اور انہوں نے اپنے ایک سفر کی روداد کو سفر نامے کی صورت میں بھی قلم بند کیا ہے جو ان کی نثری صلاحیت کا ایک الگ ثبوت ہے۔ تاہم ان کی شعری شناخت ہمیشہ ان کی نثری کاوشوں پر غالب رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقوں میں وہ بنیادی طور پر ایک شاعر کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔

۱۹۸۹ء میں علی اطہر کی شادی ہوئی۔ اور پھر ان کے دو فرزند، سید اسجد شوکت اور سید امجد شوکت، ان کی زندگی کا حصہ بنے۔ خانگی زندگی میں استحکام نے بھی بالواسطہ طور پر ان کی شعری یکسوئی کو تقویت بخشی۔ علی اطہر کی شخصیت میں سادگی، خودداری اور دوستوں کے ساتھ بے تکلفی نمایاں خصوصیات کے طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ اور یہی صفات ان کے کلام میں بھی جھلکتی ہیں جہاں تصنع کے بجائے ایک فطری اور بے ساختہ لہجہ غالب رہتا ہے۔ ادبی حلقوں میں علی اطہر کو ابتدا ہی سے سراہا گیا۔ معروف ادیب احمد ندیم قاسمی نے ان کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کیا جبکہ عاصی کرنالی اور طاہر تونسوی جیسے ناقدین نے بھی ان کی شاعری کے فنی و موضوعاتی محاسن کو تسلیم کیا۔ بقول طاہر تونسوی:

> "ڈاکٹر علی اطہر شوکت کا شمار ان جوان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنا تخلیقی شعری سفر بڑے تواتر سے جاری رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نابالغ سوچوں کی شاعری نہیں بلکہ بلوغت سے بھی آگے کی شاعری ہے۔ اس اعتبار سے ان کے تخلیقی پکوان سے کچے دودھ کی بو نہیں آتی بلکہ پکے پھلوں کا ذائقہ خوشگوار تاثرات کا حاصل لگتا ہے۔"[۱]

یہ پذیرائی اس امر کا ثبوت ہے کہ علی اطہر کی آواز محض مقامی سطح تک محدود نہیں رہی بلکہ اردو ادب کے وسیع تر منظر نامے میں بھی اس کی بازگشت سنی گئی۔

علی اطہر شوکت کے چار شعری مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "پانچواں موسم" ۱۹۹۲ء میں روحانی آرٹ پریس، ملتان سے شائع ہوا۔ جس میں زیادہ تر نظمیں شامل ہیں اور جن کا مرکزی موضوع محبت کی نفسیاتی کیفیات اور موسموں کی علامتی جہتیں ہیں۔ دوسرا مجموعہ "جلتی ریت پہ میرے پاؤں" ۱۹۹۴ء میں کتاب نگر، ملتان سے طبع ہوا۔ جس میں شاعر کی فکری پختگی اور اسلوبیاتی تنوع زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ تیسرا مجموعہ "لمس" ۱۹۹۵ء میں پلس کمیونیکیشن، لاہور سے شائع ہوا۔ جو غزل اور نظم دونوں اصناف پر مشتمل ہے اور جس میں جسمانی و روحانی احساس کے امتزاج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا چوتھا اور اہم ترین مجموعہ "اچٹتی نیند کا نوحہ" ۲۰۰۹ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ جسے ان کے فکری ارتقا کا نقطہ عروج کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں ذاتی جذبات کے ساتھ ساتھ سماجی شعور اور اجتماعی نوحہ گری بھی نمایاں طور پر شامل ہو جاتی ہے۔ ان چار بنیادی مجموعوں کا اگر ترتیب وار مطالعہ کیا جائے تو ایک واضح فکری ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی مجموعوں میں رومانوی جذبات کی نزاکت اور موسمی

استعاروں کا غلبہ ہے جبکہ بعد کے مجموعوں میں یہی رومانوی حسیت سماجی شعور اور وجودی سوالات سے گھل مل جاتی ہے۔ یہ ارتقا کسی بھی سنجیدہ تخلیق کار کی پختگی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور علی اطہر اس کسوٹی پر بھرپور طور پر پورا اترتے ہیں۔

موضوعاتی مطالعہ

علی اطہر کی ابتدائی شاعری میں محبت، ہجر اور وصال کی نفسیاتی جہتیں موضوع کے لحاظ سے نمایاں ہیں۔ محبت کوئی سطحی یا روایتی جذبہ نہیں بلکہ ایک پیچیدہ نفسیاتی کیفیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کی نظموں میں محبت کو محض حصولِ وصل کی خواہش کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ایک ایسی اندرونی کیفیت کے طور پر ابھرتی ہے جو انسان کے باطن کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ شاعر کے ہاں محبوب کا تصور بھی روایتی حسن پرستی سے ہٹ کر ایک ایسی موجودگی کے طور پر برتا گیا ہے جو وقت اور فاصلے دونوں سے ماورا محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ہجر کوئی وقتی صدمہ نہیں بلکہ ایک مسلسل کیفیت کے طور پر دکھایا گیا ہے جو شاعر کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔

اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علی اطہر کے ہاں وصال کی تمنا بھی کسی سادہ خوشی کی بشارت نہیں بلکہ ایک ایسی نازک کیفیت کے طور پر سامنے آتی ہے جس میں خوف اور امید ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ شاعر بار بار اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ زندگی کی سب سے قیمتی کیفیات وہی ہیں جو عارضی اور غیر یقینی ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وصل اور فراق ایک ہی سکے کے دو رخ کے طور پر برتے جاتے ہیں۔ یہ رویہ روایتی عشقیہ شاعری سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک وجودیاتی تفہیم کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں محبت کسی خاص فرد سے وابستگی کے بجائے ایک کائناتی کیفیت کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ نظم "قربتوں کی گود میں" اس کی خوبصورت مثال ہے۔

”تنگ کپڑوں سے کہیں اڈی ہوئی دوشیزگی
اور سڑک کے آخری نکڑ پہ کافی ہاؤس میں
انگلیوں کی ساری پوروں میں گھلاوٹ کی تڑپ
گویا جسموں کی فصیلوں سے جھلکتی آرزو
ہونٹ کے سوتوں میں کچھ کرنے کی خواہش موجزن
یخ حسیں موسم سے پتھر کی طرح جمتا لہو
قربتوں کی گود میں گرتے ہی پھر بہنے لگا
اور پھر اس قیمتی تنہائی کے من مانیاں
بھیگتے موسم میں ہر اک رنگ کی بھیگی پون
سرد جھونکوں سے سہم کر اور بھی سمٹی گئی
میں بھی ہاتھوں سے نکل کر ہونٹ تک بڑھنے لگا
اور زندگی، ہنستی رہی“[۲]

علی اطہر کی نظم نگاری کی ایک نمایاں خصوصیت موسموں کا استعاراتی استعمال ہے۔ ان کے پہلے ہی مجموعے کا عنوان "پانچواں موسم" اس امر کی دلیل ہے کہ شاعر روایتی چار موسموں سے آگے ایک ایسی پانچویں کیفیت کا تصور پیش کرنا چاہتا ہے جو دراصل جذباتی اور نفسیاتی احوال کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ پانچواں موسم نہ خزاں ہے نہ بہار، بلکہ ایک ایسی بین السطور کیفیت ہے جو محبت کے عروج وزوال کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً نظم "موسموں کا منتہا" اس حوالے سے بہترین نظم ہے۔

”مجھے جو قربت کی
نیم آغوشیاں ملیں تو
میرے مقدر کی سب ستاروں نے یہ کہا تھا
یہیں سے میرے زوال موسم کی ابتداء ہے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

اور اب کہ جب میں بھی

قُربتوں کے تمام مناظر لُٹا چکا ہوں

تو میں نے اپنے نصیب تاروں سے یہ کہا ہے

سُنو کہ مجھ پر عروج موسم کی ابتداء ہے۔"[۳]

شاعر کے ہاں موسموں کی یہ علامت نگاری محض آرائشی نہیں بلکہ فکری سطح پر بھی معنی خیز ہے۔ خزاں کا تصور اکثر فراق اور محرومی کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ بہار وصل کی نادر و عارضی کیفیت کی علامت بن جاتی ہے۔ تاہم اس مجموعے کی انفرادیت یہ ہے کہ شاعر موسموں کی اس روایتی علامت نگاری کو بھی نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی خزاں میں بھی امید کی کوئی رمق ڈھونڈلی جاتی ہے اور کبھی بہار کے عین وسط میں زوال کی پیش بینی کر لی جاتی ہے۔ یہ جدلیاتی انداز فکر علی اطہر کی شاعری کو محض جذباتی اظہار سے بلند کر کے ایک فکری تجربے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

علی اطہر کے کلام میں تنہائی، یاد اور وقت کا فلسفہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ تنہائی ایک مرکزی تجربے کے طور پر بار بار سامنے آتی ہے۔ یہ تنہائی محض جسمانی تنہائی نہیں بلکہ ایک وجودی کیفیت کے طور پر پیش کی جاتی ہے جو انسان کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی اسے گھیرے رہتی ہے۔ شاعر کے نزدیک یادیں اس تنہائی کا ایک لازمی جزو ہیں۔ وہ یادیں جو ماضی کی خوشیوں کی نہیں بلکہ ان لمحات کی ہیں جو کبھی مکمل طور پر حاصل نہیں ہو سکے۔ یہی ادھورا پن علی اطہر کی شاعری کو ایک خاص نوع کی اداسی عطا کرتا ہے جو نہ مکمل طور پر مایوسی ہے اور نہ ہی خالص امید، بلکہ ان دونوں کے درمیان معلق ایک کیفیت ہے۔

"زندگی کے تلخ جزداں میں حقیقت کی مہک

سلوٹوں کے سانپ چہرے پالنا اور سوچنا

رابطہ ٹوٹے ہوئے ناطوں سے اب ممکن نہیں

پھر بھی خوابوں میں تمنا ڈھالنا اور سوچنا"[۴]

وقت کا تصور بھی ان کے کلام میں ایک فلسفیانہ جہت رکھتا ہے۔ شاعر وقت کو ایک ایسی رو کے طور پر دیکھتا ہے جو انسان کی خواہشوں سے بے نیاز اپنے راستے پر گامزن رہتی ہے اور انسان محض اس بہاؤ کا ایک غیر اہم تماشائی بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ تصورِ وقت کسی حد تک کلاسیکی اردو شاعری کی روایت سے بھی جڑا ہے۔ جہاں زمانے کی بے ثباتی ایک بنیادی موضوع کے طور پر برتی جاتی رہی ہے لیکن علی اطہر اس روایتی موضوع کو جدید حسیت کے ساتھ ملا کر ایک تازہ اظہار عطا کرتے ہیں۔ نظم " مسافت کا سوگ لمحہ " اس کی مثال ہے۔

"میری محبت

مسافتوں کا اداس حصہ

میری محبت کی ہوا کی وحشت

میری محبت سراب لمحوں کا خواب اوڑھے

ملن کے سپنوں کی

پیاس اوڑھے

وفا کی بابت سلگ رہی ہے"[۵]

علی اطہر کی شاعری کا ایک اہم اور قابلِ ستائش پہلو یہ ہے کہ یہ محض ذاتی جذبات کے اظہار تک محدود نہیں رہتی بلکہ سماجی شعور اور اجتماعی دکھ کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ خصوصاً "اچٹتی نیند کا نوحہ" میں یہ رجحان زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس مجموعے کا عنوان ہی اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کے نزدیک نیند بھی سکون کی علامت نہیں رہی بلکہ ایک ادھوری اور بے سکون کیفیت میں بدل گئی ہے۔ جو بالواسطہ طور پر اس دور کے سماجی و سیاسی انتشار کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ علی اطہر کا تخلیقی سفر اس دور سے گزرا جب ملک سیاسی جبر اور سماجی تناؤ کے کئی مراحل سے دوچار رہا۔ ایسے ماحول میں جہاں اجتماعی سطح پر مایوسی اور بے یقینی غالب رہی۔ شعرا کا ایک طبقہ اس کرب کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتا رہا۔ علی اطہر بھی اسی روایت سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم ان کا امتیاز یہ ہے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

کہ وہ سماجی موضوعات کو بھی ذاتی جذباتی تجربے کی چاشنی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری میں نعرہ بازی کے بجائے ایک دھیمی مگر گہری تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ انسانی قدروں کے زوال، آزادیِ فکر کی خواہش اور سماجی جبر کے خلاف ایک خاموش احتجاج ان کے کلام میں بار بار محسوس ہوتا ہے مگر یہ احتجاج کبھی بھی سیاسی بیانیے کی صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ شعری لطافت کے دائرے میں رہتا ہے۔ نظم "دکھ کی مٹی"، "اوجڑی کیمپ" اور "بے حسی کے لبادے" اس کی مثالیں ہیں۔

علی اطہر کی غزل گوئی میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کا امتزاج ایک الگ مطالعے کا متقاضی ہے کیونکہ یہاں وہ روایتی غزلیہ اسلوب کو برتتے ہوئے بھی ایک نیا لہجہ تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں عشقِ مجازی کی رنگینی اور عشقِ حقیقی کی متانت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور اکثر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر کس سطح پر بات کر رہا ہے۔ یہ ابہام دراصل ایک خوبی کے طور پر برتا گیا ہے کیونکہ یہی وہ کیفیت ہے جو کلاسیکی اردو غزل کی پہچان رہی ہے اور علی اطہر اس روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اسے اپنے عہد کی حسیت سے بھی ہم آہنگ کرتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں علامتوں اور استعارات کا ایک ہجوم ہے۔ جیسے لفظ "شہر"، "دھند" اور "چراغ" جیسے استعارات کا بار بار استعمال مگر ہر بار ان میں ایک نیا معنوی زاویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ "شہر" کا تصور کبھی محبوب کی موجودگی کی علامت بن جاتا ہے اور کبھی اجتماعی بے حسی کی نشاندہی کرتا ہے۔ "دھند" بے یقینی اور ابہام کی کیفیت کو بیان کرتی ہے، جبکہ "چراغ" امید کی اس ننھی سی لو کا استعارہ بنتا ہے جو ہر اندھیرے کے باوجود بجھنے سے انکاری ہے۔ یہ علامتی کھیل علی اطہر کی غزل کو ایک ایسی کیفیت عطا کرتا ہے جسے ناقدین "اندرونی سفر" یا داخلی کرب کے اظہار سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی غزل کا ہر شعر دراصل شاعر کے باطن کی کسی نہ کسی پرت کو کھولنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

علی اطہر کی شعری شخصیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی نظم نگاری اور غزل گوئی کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جائے۔ کیونکہ یہ دونوں اصناف ان کے ہاں مختلف اظہاری مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں۔ نظم میں شاعر کو وہ فنی آزادی حاصل ہوتی ہے جو اسے کسی ایک موضوع کو طویل تر اور تفصیلی انداز میں برتنے کا موقع دیتی ہے۔ علی اطہر اس آزادی سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی نظموں میں موضوع کی پیش کش زیادہ پیچیدہ اور کئی پہلوؤں پر مشتمل دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی نظم میں وہ کبھی ذاتی جذبات سے آغاز کرتے ہیں اور بتدریج اس جذبے کو ایک وسیع تر سماجی یا فلسفیانہ تناظر میں لے جاتے ہیں،۔ جس سے قاری کو ایک مکمل تجربے سے گزرنے کا احساس ہوتا ہے۔

اس کے برعکس غزل کے میدان میں علی اطہر کو ہیئت کی سختی کا سامنا رہتا ہے مگر وہ اس سختی کو کسی رکاوٹ کے بجائے ایک فنی چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر کو ایک مکمل اکائی کی صورت میں مکمل کرنا، اور اس کے باوجود پوری غزل میں ایک داخلی ربط برقرار رکھنا، ایک نازک فنی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ علی اطہر کی غزلیں اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ اس مہارت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے اشعار اگرچہ بظاہر الگ الگ خیالات پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر مجموعی طور پر ایک ہی جذباتی فضا کی تشکیل کرتے ہیں جو پوری غزل پر محیط رہتی ہے۔

یہ فرق محض ہیئتی سطح تک محدود نہیں بلکہ موضوعاتی سطح پر بھی محسوس ہوتا ہے۔ نظم میں علی اطہر زیادہ تر اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کو براہِ راست بیان کرتے ہیں، جس سے ایک خاص نوعیت کی صداقت اور بے ساختگی پیدا ہوتی ہے۔ غزل میں، روایت کے مطابق، وہ زیادہ تر علامتی اور استعاراتی پیرائے میں بات کرتے ہیں، جس سے کلام میں ایک کلاسیکی تہہ داری شامل ہو جاتی ہے۔ دونوں اصناف میں یہ امتیاز ان کی فنی بصیرت کا ثبوت ہے کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کس موضوع کو کس صنف کے ذریعے بہترین طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

علی اطہر کی شاعری کا ایک اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی حسیت سے بھرپور طور پر آگاہ دکھائی دیتے ہیں، مگر اس آگاہی کے باوجود وہ روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑتے۔ یہ توازن آج کے دور میں ایک نادر خوبی سمجھا جا سکتا ہے، کیونکہ بہت سے معاصر شعرا یا تو مکمل طور پر روایتی اسلوب میں محصور رہتے ہیں یا روایت سے مکمل انحراف کرتے ہوئے ایک ایسی جدیدیت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو قاری کے لیے ابلاغ کا مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ علی اطہر اس دوراہے پر ایک متوازن راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جدید دور کے انسان کی نفسیاتی پیچیدگیاں، شناخت کے بحران، اور تیز رفتار زندگی کے باعث پیدا ہونے والی تنہائی جیسے موضوعات بھی جھلکتے ہیں، مگر یہ تمام موضوعات روایتی فارم اور زبان کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ امتزاج ان کے کلام کو ایک خاص نوعیت کی رسائی عطا کرتا ہے۔ وہ قاری جو روایتی شاعری کا ذوق رکھتا ہے۔ علی اطہر کے کلام میں اپنی پسندیدہ ہیئت اور زبان پاتا ہے جبکہ وہ قاری جو جدید موضوعات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے بھی اپنے عہد کے مسائل اس شاعری میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ ترین اس حوالے سے لکھتی ہیں:

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

> ”اطہر علی کی بہت سی نظموں میں رومان کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا شعور بھی دکھائی دیتا ہے مارشل لاء اور جبر، معاشرے کا جبر، انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کے اظہار کے لیے وہ نئی نئی تراکیب وضع جرتا ہے۔ بندھے ٹکے اسالیب کی جگہ آج کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے مسائل کے اظہار کے لیے بھی اس نے نئے حوالے تلاش کئے ہیں۔“[۶]

ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ علی اطہر کی شاعری میں مذہبی یا تصوفانہ رنگ بھی بالواسطہ طور پر موجود رہتا ہے۔ خصوصاً ان کے سادات گھرانے سے تعلق اور ملتان کی صوفیانہ ثقافت کے پس منظر میں اسے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ تصوفانہ رنگ کبھی بھی واضح مذہبی بیانیے کی صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ ایک لطیف روحانی حسیت کے طور پر کلام میں جذب ہو جاتا ہے، جو قاری کو محسوس تو ہوتی ہے مگر اسے کسی خاص عقیدے یا نظریے سے مشروط نہیں کیا جاتا۔

علی اطہر کی شاعری کو ادبی حلقوں میں جو پذیرائی ملی۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پذیرائی کسی ایک مخصوص نظریاتی یا تنقیدی دھارے سے وابستہ نہیں رہی۔ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ناقدین نے ان کے کلام کو سراہا۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں ایسی آفاقی خوبیاں موجود ہیں جو نظریاتی اختلافات سے ماورا ہو کر قاری اور ناقد دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے ادیب کی جانب سے ملنے والی پذیرائی اس بات کی دلیل ہے کہ علی اطہر کا کلام محض مقامی یا علاقائی سطح پر ہی قابلِ تعریف نہیں رہا بلکہ اردو ادب کے مرکزی دھارے کے سنجیدہ ناقدین نے بھی اسے توجہ کے لائق سمجھا۔

یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کسی بھی شاعر کی حقیقی ادبی حیثیت کا تعین وقت کے ساتھ ہوتا ہے، اور علی اطہر کا تخلیقی سفر، جو ۱۹۹۲ء سے شروع ہو کر مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ۲۰۰۹ء اور اس کے بعد تک جاری رہا، اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت کسی وقتی جوش کی پیداوار نہیں بلکہ ایک مستقل اور پختہ فکری عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسے شعرا جو طویل مدت تک اپنی تخلیقی یکسوئی برقرار رکھتے ہیں اور اپنے فن میں مسلسل ارتقا کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہی بالآخر ادبی تاریخ میں دیرپا مقام حاصل کرتے ہیں۔ علی اطہر اس کسوٹی پر بھی پورا اترتے دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوبیاتی وفنی جائزہ

علی اطہر کی شعری زبان کا سب سے نمایاں وصف اس کی سادگی اور بے ساختگی ہے۔ وہ ثقیل تراکیب اور پیچیدہ فارسی آمیز زبان سے گریز کرتے ہوئے ایک ایسی زبان اختیار کرتے ہیں جو عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم ہو۔ مگر اس سادگی میں بھی معنی کی تہہ داری برقرار رہتی ہے۔ یہ امر کسی بھی شاعر کے لیے ایک نازک امتحان ہوتا ہے کیونکہ سادہ زبان میں عمیق مفاہیم کی ترسیل آسان کام نہیں۔ علی اطہر اس امتحان میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار بظاہر سادہ ہونے کے باوجود قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے ہاں استعاروں اور تشبیہات کا انتخاب بھی روزمرہ زندگی کے مشاہدات سے کیا جاتا ہے۔ موسم، رات، چراغ، دھند، ریت اور سفر جیسے عمومی تجربات کو وہ ایک خاص فنی چابکدستی سے علامتی سطح پر منتقل کر دیتے ہیں۔ "جلتی ریت پر میرے پاؤں" کا عنوان بذاتِ خود اس فنی حکمت کی ایک مثال ہے۔ ریت پر قدموں کے نشان کی عدم استقامت کو زندگی کی بے ثباتی اور انسانی کاوشوں کی عارضی نوعیت سے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ یہ علامت اتنی آسان ہے کہ ہر قاری اسے سمجھ سکتا ہے مگر اس کی معنوی گہرائی ایک سنجیدہ قاری کو بار بار اس کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتی ہے۔

تجرباتی لحاظ سے علی اطہر کی نظم نگاری میں آزاد نظم اور پابند نظم دونوں اصناف شامل ہیں۔ تاہم ان کا رجحان زیادہ تر آزاد نظم کی طرف رہا ہے جہاں وہ روایتی وزن اور قافیہ بندی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنے جذبات کو زیادہ فطری انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان کی آزاد نظم میں بھی ایک داخلی موسیقیت موجود رہتی ہے جو محض الفاظ کی نشست و برخاست سے نہیں بلکہ جذبے کی صداقت سے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ نظمیں طویل بھی ہیں۔ جن میں موضوع کو کئی زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ کچھ نظمیں نسبتاً مختصر ہیں اور ایک ہی لمحاتی کیفیت کو نہایت کفایت لفظی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

نظم میں ان کی ایک اور خصوصیت بیانیہ (narrative) اور غنائیہ (lyrical) عناصر کا امتزاج ہے۔ کچھ نظموں میں واضح طور پر ایک کہانی یا واقعہ بیان ہوتا دکھائی دیتا ہے جبکہ دیگر نظموں میں محض ایک جذباتی کیفیت کو موسیقیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تنوع علی اطہر کی فنی استعداد کا ثبوت ہے۔ جو اپنے مواد کے تقاضوں کے مطابق مختلف اسلوب اپنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقول ظہیر کاشمیری:

> ”اسلوب کے معاملے میں سید علی اطہر شوکت روایت پرست نہیں وہ لفظوں، تشبیہوں، استعاروں اور تلازموں کے استعمال کے لیے تخلیقی استعارے سے کام لیتا ہے۔ اس کا انداز بیاں سادہ اور پرکار ہے۔“[۷]

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

غزل کے میدان میں علی اطہر روایتی اوزان اور بحور کی پاسداری کرتے ہیں۔ اس پاسداری کے باوجود ان کے ہاں ایک خاص جدت بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ مشکل اور غیر مستعمل اوزان کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اور ایسی بحور کا انتخاب کرتے ہیں جو روانی اور سلاست کے حامل ہوں۔ یہ انتخاب اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کے نزدیک فنی پابندی کبھی بھی جذبے کی ترسیل میں حائل نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہیئت کو ہمیشہ مواد کی خدمت میں رہنا چاہیے۔ قافیہ بندی میں بھی علی اطہر روایتی اور تازہ دونوں رویوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ کبھی وہ مستعمل اور مقبول قوافی کا انتخاب کرتے ہیں جو سامع یا قاری کے لیے فوری طور پر مانوس محسوس ہوتے ہیں۔ اور کبھی نسبتاً کم مستعمل قوافی کے ذریعے اپنے کلام کو ایک تازگی بخشتے ہیں۔ یہ توازن ان کی فنی پختگی کی علامت ہے۔

علی اطہر کے کلام کی فنی و موضوعاتی خوبیوں میں ان کی شعری حکمت عیاں ہے۔ ان کے ہاں محبت کی کیفیت کو وقت کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے یہ خیال پیش کیا جاتا ہے کہ زندگی کے سب سے قیمتی لمحات وہی ہیں جو ہاتھ سے پھسل جانے کے باوجود یادوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ ایک اور مقام پر شاعر تنہائی کو ایک ایسی کیفیت کے طور پر پیش کرتا ہے جو نہ مکمل طور پر بوجھ ہے اور نہ مکمل طور پر سکون بلکہ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان معلق ایک حالت ہے جس میں انسان اپنے آپ سے مکالمہ کرتا ہے۔

"بند اک کمرہ، چپ کا منظر، بھولی بسری دیپک یاد
تنہائی، دکھ، خوف کی لذت، دلبر جانی، تُو اور میں
تتلی، خوشبو، رنگ کی باتیں، شبنم سے شرمیلے خواب
آس کا پنچھی، گم سم خواہش، رات کی رانی، تُو اور میں" [۸]

ان کے ہاں علامتوں کا برتاؤ بھی قابلِ توجہ ہے۔ چراغ کی علامت بار بار ایسے سیاق میں استعمال ہوتی ہے جہاں امید کی ایک معمولی سی رمق پوری تاریکی کے مقابل کھڑی دکھائی جاتی ہے، اور یہ تضاد شاعر کے فلسفیانہ رویے کی غمازی کرتا ہے جس میں مایوسی کے باوجود امید کا دامن کبھی پوری طرح نہیں چھوڑا جاتا۔ شہر کی علامت کہیں محبوب کی یاد سے وابستہ گلیوں اور مکانوں کی نمائندگی کرتی ہے اور کہیں اجتماعی زندگی کی بے رونقی اور سماجی فاصلوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ کثیر المعنویت علی اطہر کی شعری زبان کی ایک بنیادی خصوصیت ہے جو ان کے کلام کو ایک سے زیادہ سطحوں پر پڑھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

علی اطہر کے کلام میں الفاظ کا انتخاب اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ زبان کو نہایت احتیاط اور فنی شعور کے ساتھ برتتے ہیں۔ وہ بھاری بھرکم اور مہجور الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اور ایسی لفظیات کو ترجیح دیتے ہیں جو روزمرہ گفتگو کے قریب تر ہوں مگر شعری سیاق میں آ کر ایک نئی معنویت اختیار کر لیں۔ مثال کے طور پر "ریت"، "دھند"، "موسم" اور "سفر" جیسے الفاظ ان کے ہاں محض بیانیہ عناصر نہیں بلکہ پورے کلام کی فکری بنیاد بن جاتے ہیں۔ یہ الفاظ بار بار مختلف نظموں اور غزلوں میں مختلف معنوی جامہ پہن کر سامنے آتے ہیں، جس سے ان کے پورے شعری مجموعے میں ایک داخلی ربط اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ نظم "رزمِ امکاں" میں الفاظ کے چناؤ کی خوبصورتی:

"کسی تاراج موسم کی بغاوت سے
ملن کا سامری آتش فشاں لمحۂ وصالِ انتہا کی دسترس سے یوں گریزاں ہے
کہ جیسے رابطہ امکان کی سولی پر
نزع کے الوداعی آخری بوسے کی دہشت میں
کمالِ آرزو کی انگبیں قسمت۔" [۹]

اسی طرح تراکیب کی سطح پر بھی علی اطہر ایک متوازن رویہ اپناتے ہیں۔ وہ نہ تو فارسی تراکیب کے زیادہ استعمال سے کلام کو ثقیل بناتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر انہیں ترک کر کے زبان کی شعری چاشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایک منتخب اور برجا استعمال، جو معنی کی ترسیل میں مدد دے نہ کہ رکاوٹ بنے، ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔ یہی توازن انہیں ایسے قارئین تک رسائی دیتا ہے جو سادہ لیکن پُر معنی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمود ناصر ملک:

"علی اطہر کی شاعری شام کی بانسری کا ایک گیت ہے۔ اس کے حرفوں اور لفظوں میں وہی من موہنی مٹھاس اور دلوں کے اندر بس جانے والی اداسی ہے جو بانسری کی تانوں میں ہے۔ اس کے لفظ دلوں میں لمس کی ایک انوکھی

کیفیت چھوڑ جاتے ہیں، جو محبت کے راستوں کے پہلے سفر کی لذت اور پھر ان سے ہجرت کے تصور کی ملتی جلتی کیفیت ہے۔ اس کی غزلوں میں ہندی الفاظ اور گیتوں کا رچاؤ ہے۔ جو ایک منفرد اسلوب لیے ہوئے ہیں۔ اور میری دانست میں یہی غزلیں علی اطہر کی پہچان ہیں۔[۱۰]

علی اطہر کی شاعری میں حسی تجربات بھی نمایاں ہیں۔ وہ محض تجریدی خیالات بیان کرنے کے بجائے انہیں لمس، نظر، اور سماعت جیسے حسی تجربات سے مربوط کرکے پیش کرتے ہیں۔ ان کے ایک مجموعے کا نام ہی "لمس" ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کے نزدیک جذبات کا اظہار محض ذہنی یا تجریدی سطح پر نہیں بلکہ ایک مکمل حسی تجربے کے طور پر ہونا چاہیے۔ چھونے، دیکھنے اور سننے کے تجربات ان کے کلام میں جذباتی کیفیات کو ایک ٹھوس اور قابلِ احساس شکل عطا کرتے ہیں۔ جس سے قاری کو محض ذہنی سطح پر نہیں بلکہ ایک جسمانی ونفسیاتی سطح پر بھی شاعری سے جوڑنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ حسیاتی طرزِ اظہار علی اطہر کی شاعری کو ایک خاص نوعیت کی زندگی اور تپش عطا کرتا ہے جو اسے محض فکری مباحث سے بلند کرکے ایک مکمل تخلیقی تجربے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ملتان کی جدید اردو شاعری کی تاریخ میں علی اطہر شوکت کا نام ایک ایسے تخلیق کار کے طور پر لیا جاتا ہے جس نے علاقائی ادبی روایت کو وسیع تر اردو ادب سے مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا کلام محض مقامی پذیرائی تک محدود نہیں رہا بلکہ ملک کے دیگر علمی و ادبی مراکز میں بھی توجہ کا مرکز بنا۔ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ علی اطہر کی شاعری میں موجود مسائل اور جذبات کسی خاص علاقے یا زمانے تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمگیر انسانی تجربے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ملتان جیسے شہر سے تعلق رکھنے والے شاعر کے لیے یہ ایک قابلِ ستائش کامیابی ہے کہ وہ اپنی علاقائی شناخت سے دستبردار ہوئے بغیر بھی اردو ادب کے مرکزی دھارے میں اپنی جگہ بنائے۔ علی اطہر کی شاعری میں ملتان کی ثقافتی تہہ داری، یہاں کی صوفیانہ فضا اور مقامی زندگی کے مخصوص تجربات بالواسطہ طور پر جھلکتے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی واضح علاقائی رنگ کے اظہار سے گریز کرتے ہوئے اپنے کلام کو ایک عمومی اور عالمگیر اظہار میں ڈھالتے ہیں۔

ڈاکٹر سید علی اطہر شوکت کی شاعری محض رومانوی اظہار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسے حساس ذہن کی تخلیقی روداد ہے جو ذاتی جذبات کو سماجی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ ان کی نظم نگاری میں موسموں کی علامتی جہتیں، تنہائی کا فلسفیانہ اظہار اور سماجی کرب کی دھیمی مگر مؤثر ترجمانی نمایاں ہیں اور ان کی غزل گوئی میں روایت کو نئے معنوی امکانات سے روشناس کرانے کی صلاحیت دکھائی دیتی ہے۔ زبان کی سادگی، علامتوں کی تہہ داری اور جذبے کی صداقت ان کی شاعری کے وہ بنیادی محاسن ہیں جو انہیں جدید ملتانی اردو شاعری کی ایک معتبر آواز بناتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علی اطہر شوکت کی شعری کائنات روایت اور جدت کے درمیان ایک متوازن پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ نہ تو روایت سے مکمل انحراف کرتے ہیں اور نہ ہی جدیدیت کی محض تقلید میں اپنی انفرادیت گنوا دیتے ہیں۔ بلکہ ایک ایسا درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں جس میں دونوں رویوں کی بہترین خصوصیات یکجا ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ امتیاز ہے جو انہیں ملتان کے ادبی افق پر ایک منفرد اور دیرپا مقام عطا کرتا ہے، اور آئندہ تحقیق کے لیے بھی ان کا کلام ایک زرخیز میدان فراہم کرتا رہے گا۔

اپنے سچ کی آگ میں جلنا دیکھا ہے
زندہ رہ کر ہم نے مرنا دیکھا ہے [۱۱]
(علی اطہر)

حوالہ جات

۱۔ طاہر تونسوی، "محبت کے خوابوں کی شاعری" مشمولہ، پانچواں موسم، روحانی آرٹس پریس، ملتان، ۱۹۹۲ء، ص ا

۲۔ علی اطہر شوکت، ڈاکٹر، پانچواں موسم، ، روحانی آرٹس پریس، ملتان، ۱۹۹۲ء، ص ۴۹

۳۔ ایضاً، ص ۷۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۔ علی اطہر شوکت، ڈاکٹر، "جلتی ریت پہ میرے پاؤں"، کتاب نگر، ملتان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 02 (2026)

۶۔ روبینہ ترین،ڈاکٹر، "تاریخ ادبیات ملتان"، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد، ۲۰۱۲،ص ۱۹۱

۷۔ علی اطہر شوکت،ڈاکٹر، "لمس"، پلس کمیونیکیشن،لاہور، ۱۹۹۵ء،ص ۲

۸۔ علی اطہر شوکت،ڈاکٹر،پانچواں موسم،،روحانی آرٹس پریس،ملتان، ۱۹۹۲ء،ص ۳۳

۹۔ علی اطہر شوکت،ڈاکٹر، "اچٹتی نیند کا نوحہ"،شب تاب پبلشرز،اسلام آباد، ۲۰۰۹ء،ص ۸۹

۱۰۔ محمود ناصر، "پس لفظ" مشمولہ، جلتی ریت پہ میرے پاؤں، کتاب نگر،ملتان، ۱۹۹۴ء،ص ۱۲۰،۱۱۹

۱۱۔ علی اطہر شوکت،ڈاکٹر،پانچواں موسم،،روحانی آرٹس پریس،ملتان، ۱۹۹۲ء،ص ۶۹